**Negotiations 2:2 (2022) pp. 01-10** **ISSN: 2789-293X**

# محمد سلیم ملک کے انشائے لطیف

## *Muhammad Saleem Malik's "Light Essays"*

Saira Irshad
Lecturer, Department of Urdu, Government Sadiq College Women University, Bahawalpur

**KEYWORDS**

Insightful
Meaningful
Heartwarming
Imaginative
Organic Power
Technical Attributes
Awareness

**DATES**

Received 22-03-2022
Accepted 10-05-2022
Published 20-06-2022

**QR CODE**

**ABSTRACT**

*Informal and light-hearted expression on any subject is called "Light Essay". Muhammad Saleem Malik's collection based on essays was published under the title "Batein humari yad rahein ". This collection includes an intellectual expression of the social situation. Most of the inscriptions are a reflection of the twentieth century when love and sincerity were established in hearts instead of bitterness. Muhammad Saleem Malik's style of writing is simple and smooth; he is familiar with the art of speaking that is why "Batein humari yad rahein " is not only common sense in expression but also adapts to interesting situations from everyday life. Mohammad Saleem Malik's essay collection has the potential to prove its importance in Urdu literature.*

DOI:https://doi.org/10.54064/negotiations.v2i2.50

**تلخیص:**

کسی بھی موضوع پر غیر رسمی اور ہلکے پھلکے انداز میں اظہار کرنا "انشائیہ" کہلاتا ہے۔ انشائیہ نگاری کا موجودہ تصور تقسیم ہند کے بعد واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ محمد سلیم ملک کا انشائیوں پر مبنی مجموعہ "باتیں ہماری یاد رہیں" کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مجموعے میں معاشرتی صورتحال کا

فکری اظہار شامل ہے۔ اکثر انشائیے بیسویں صدی کے عکاس ہیں کہ جب دلوں میں ایک دوسرے سے کدورت کی بجائے محبت و خلوص کا رشتہ قائم تھا ، محمد سلیم ملک کا انداز تحریر سادہ اور سلیس ہے، وہ بات سے بات نکالنے کے ہنر سے آشنا ہیں، یہی وجہ ہے کہ "باتیں ہماری یاد رہیں" نہ صرف اظہارِ بیاں میں عام فہم ہے بلکہ روزمرہ زندگی کے واقعات سے دلچسپ صورتحال اختیار کر لیتے ہیں۔ محمد سلیم ملک کا انشائی مجموعہ اردو ادب میں اپنی اہمیت منوانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

انشائیہ نگاری کی صنف انگریزی زبان سے اُردو ادب میں آئی۔ انگریزی میں اسے Light Essa''y " کہا جاتا ہے۔ اُردو میں انشائیہ کا لفظ "انشا" سے نکلا ہے جسے آغاز میں "رَف ڈرافٹ" بھی کہا جاتا تھا۔ "اصنافِ نظم و نثر" میں اس حوالے سے درج ہے۔

جب انگریزی Essay یا فرانسیسی Essai کی طرز پر اُردو میں تخیلاتی تحریریں وجود میں آنے لگیں تو انھیں تخیل آفرینی اور عبارت آرائی کی بناء پر "انشائیہ" کا نام دیا گیا۔[1]

اُردو ادب میں انشائیے کی کوئی حتمی تعریف مقرر نہیں کی جاسکتی تاہم اس کی خصوصیات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی بھی موضوع پر غیر رسمی اور ہلکے پھلکے انداز میں اظہار کرنا انشائیہ کہلاتا ہے۔

انشائی ادب کو کئی ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ انشائیہ، انشا پردازی، انشائے لطیف، خیالات پریشاں، ادب لطیف، جواہر پارے، مضمون، جواب مضمون، ایسے Essay ،لائٹ ایسے، پرسنل ایسے وغیرہ۔[2]

انشائیہ اسلوب کا حصہ قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ یہ الگ صنف ہے جس میں داخلی کیفیت کو اظہار کے پیرائے میں ڈھالا جاتا ہے۔ اسی وجہ سے یہ جداگانہ مزاج کا حامل ہے۔ انشائیے میں سادہ اور عام فہم لب و لہجے کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔

۱۵۷۱ء میں فرانسیسی ادب "مونتین" نے مضامین کی بنیاد ڈالی اور انھیں " Essai "کا نام دیا جسے انگریزی زبان میں "Essay " کہا جانے لگا۔ مونتین نے اپنے مضامین میں داخلی جذبات اور ذاتی احساسات شامل کیے اور واضح کیا کہ وہ خود اپنی کتاب کا موضوع ہیں۔ مونتین کے نثر پاروں سے فرانس کی تہذیب و ثقافت سے بھرپور آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ انگریزی میں Essay کی ابتداء بیکن (۱۵۷۱ء۔۱۶۲۸ء) سے ہوئی انھوں نے مونتین کے داخلی انداز کی بجائے خارجیت کو موضوع بنایا۔ اسی صنف میں ایک اور اہم نام ابراہم کاؤنے (۱۶۱۸ء۔۱۶۶۷ء) کا ہے۔ انھوں نے مونتین کی تقلید کرتے ہوئے Essay کو اندرونی جذبات و احساسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ اسی حوالے سے "ہٹل" اور "ایڈلین" کو بھی بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کی تقلید میں سر سیّد احمد خان نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" کا اجراء کیا۔

مغرب کے مقابلے میں مشرق کے انشائیہ نگاروں کا ظہور اخبارات کی بجائے ادبی رسائل کا مرہونِ منت ہے۔[3]

انشائیہ نگاری کا موجودہ تصور تقسیم ہند کے بعد واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ ۱۹۶۰ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیوں پر مبنی کتاب "خیال پارے" اس سلسلے میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے اسی دور میں عصمت اللہ اور ڈاکٹر فہیم عظمی نے اس تحریر کو آگے بڑھایا جب کہ انشائیے کے خلاف رد عمل بھی

---

[1] علی محمد خان، اشفاق احمد ورک، **اصنافِ نظم و نثر** (لاہور: الفیصل ناشران و تاجران کتب، 2016ء)، 305۔

[2] وحید قریشی، **اُردو کا بہترین انشائی ادب** (لاہور: مکتبہ فکر و ادب، س۔ن ء)، 12۔

[3] انجم نیازی، **فل سٹاپ مشمولہ "نئے انشائیے"، مرتبہ: سلیم آغا قزلباش** (لاہور: مکتبہ فکر و خیال، 1991ء)، 91-92۔

پیدا ہوا۔ انشائیہ نگاری کے اس سلسلے کو آگے بڑھانے میں اکبر حمیدی، ڈاکٹر سلیم اختر، انجم نیازی، ناصر عباس نیر، مشتاق قمر اور جمیل آذر نے نمایاں کردار ادا کیا۔ اُردو انشایئے میں تحقیق و تنقید کے نتیجے میں انشائیہ کے مزاج، خدوخال، تعریف، حدود، امکانات اور فنی اوصاف کے ذریعے اس کی پہچان واضح ہوئی جب کہ کئی ادبی مجلّوں نے خصوصی نمبر شائع کیے جو اس صنف کی الگ پہچان بنانے میں مددگار ثابت ہوئے۔

انشائیہ فراز یا نشیب کی نہیں ہموار سطح کی پیداوار ہے۔[4]

انشائیہ نگاری نے جہاں مختصر عرصے میں خود کو منوایا ہے وہیں خطۂ بہاول پور میں بھی اس صنف کے حوالے سے طبع آزمائی کی گئی اور کئی خوب صورت انشایئے منظر عام پر آئے۔ اس حوالے سے ڈاکٹر محمد سلیم ملک، حیدر قریشی، علی معین، منور عثمانی اور اظہر ادیب انفرادیت کے حامل ہیں۔

محمد سلیم ملک ۳/ دسمبر ۱۹۵۰ء کو رحیم یار خان کے نواحی علاقے ۴۸۔ این پی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ۱۹۶۷ء میں میٹرک کا امتحان گورنمنٹ پائلٹ سکول رحیم یار خان سے پاس کیا جب کہ جامعہ کراچی سے ایم۔ اے اُردو میں گولڈ میڈل حاصل کیا۔ انھوں نے ۱۹۷۹ء کو ریڈیو پاکستان بہاول پور میں بطور ریڈیو پروڈیوسر کام کیا جب کہ کچھ عرصہ بعد اسلامیہ یونیورسٹی بہاول پور میں ملازمت اختیار کی۔ محمد سلیم ملک نے ۱۹۸۸ء میں ''امتیاز علی تاج۔ زندگی اور فن'' کے عنوان سے مقالہ لکھ کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے ۲۰۰۲ء میں اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور میں ملازمت کی جب کہ ۲۳/ اپریل ۲۰۰۵ء میں پنجاب یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اُردو کی حیثیت سے ذمہ داری انجام دی اور ۳/ دسمبر ۲۰۱۰ء میں اسی ادارے سے ریٹائرمنٹ لی۔ آج کل ڈیفنس لینگوئج انسٹی ٹیوٹ کیلی فورنیا میں ملازمت اختیار کیے ہوئے ہیں۔

محمد سلیم ملک کی تصانیف ''لبید بہاول پوری۔ شخصیت اور شاعر''، ''جھلار''، ''سیّد امتیاز علی تاج۔ زندگی اور فن''، ''باتیں ہماری یاد رہیں (انشائیہ)''، ''امتیاز علی تاج (تحقیق و تنقید)''، ''لکیریں (تحقیق و تنقید)''، ''تلاش (تحقیق و تنقید)''، ''پاک چین مکالمہ (تالیف و ترجمہ)''، ''اُردو تحقیق پنجاب یونیورسٹی میں''، ''سیّد امتیاز علی تاج کے یک بابی ڈرامے''، ''اُردو زبان میں کتاب''، ''سیّد امتیاز علی تاج کی تمثیل شناسی''، ''بہارِ اُردو'' اور ''سیّد امتیاز علی تاج کے ڈرامے بچوں کے لیے'' کے عنوان سے منظرِ عام پر آچکی ہیں۔

محمد سلیم ملک کا انشائیوں پر مبنی مجموعہ ''باتیں ہماری یاد رہیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ''ٹیلی فون'' ایک انتہائی اہم ایجاد کے حوالے سے تفصیلات پر مبنی ہے۔ اسے اُردو کے محاورے ''دُور کے ڈھول سہانے'' کی مانند قرار دیا گیا ہے۔ ٹیلی فون کی آواز اس طرح محسوس ہوتی ہے جیسے فرشتے مخاطب ہوں۔ اس ایجاد کی بدولت روابط میں آسانی پیدا ہوئی۔ اکثر لوگ ٹیلی فون ڈائریکٹری سنبھال کے رکھتے ہیں جب کہ ایسے لوگ بھی پائے جاتے ہیں جو دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر غیر ضروری نمبروں کی تلاش میں خود کو مصروف رکھتے ہیں۔ تاہم معاشرتی رویوں پر طنز کرتے ہوئے اس انشایئے میں حقیقت سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

---

[4] شاہد حسن رضوی، **الزبیر (شمارہ نمبر۔1)** (بہاول پور: اُردو اکیڈمی، 2014ء)، 91-92۔

یوں تو بے شمار باتیں ہیں جو فون پر کی جاتی ہیں۔ کس کس کا حساب لکھیں، عذاب لکھیں، ثواب لکھیں یا نئے زمانے کے خواب لکھیں مگر ان میں ایک چنی ہوئی قسم سفارشی فون کی ہے۔ اس کی خوبیاں تو بہت دیکھی ہیں مگر خرابی کوئی نہیں سنی، جیسے آپ سفارشی رقعہ لکھیں تو حکومت بدلنے پر وہ رقعہ گلے کا پھندہ بن جائے گا۔[5]

محمد سلیم ملک سنسنی پھیلانے والوں کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں کہ اس طرح کے لوگ یہ خوش فہمی پال لیتے ہیں کہ جیسے انھوں نے کوئی معرکہ سر انجام دیا ہو۔ کچھ لوگ ٹیلی فون پر مستقل بولنے میں مصروف رہتے ہیں جب کہ اکثر گھبراہٹ کا شکار بھی ہو جاتے ہیں۔ غرض ٹیلی فون کے حصار سے کسی کو بھی فرار ممکن نہیں۔ اس حوالے سے خواتین بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتیں۔ گھر کے کاموں سے فراغت ملتے ہی وہ فون پر مصروف دکھائی دیتی ہیں۔ ان کی بے ترتیبی سے گفتگو سے خاطر خواہ نتائج اخذ کیے جاسکتے ہیں۔ دفتری ملازم کی مصروفیات اور گھریلو ضروریات سے نبرد آزما ہونے کے بارے میں خوب صورت منظر کشی کی گئی ہے۔

بلاشبہ ٹیلی فون کے ابتدائی دور میں لوگ انتہائی اہتمام سے بات کرتے تھے تاہم وقت کے ساتھ ساتھ تکلّفات میں کمی آتی گئی۔ یہ انشائیہ موبائل فون کی آمد سے قبل لکھا گیا تاہم اس میں ٹیلی فون کی ضرورت کے بارے میں شدت سے سماں باندھا گیا ہے۔ یہ منظر کو محفوظ کرتا ہے اس کی بجائے موبائل فون ہوتا تو لوگ اپنے اپنے معاملات میں مصروف دکھائی دیتے۔ انشائیہ نگاری میں شگفتگی اور تروتازگی کا عنصر جابجا ملتا ہے جس کی وجہ سے قاری سرشاری محسوس کرتا ہے۔ انشائیے میں غیر رسمی اور جدید ترین صورتِ حال کو مدنظر رکھا جاتا ہے جس سے سوچ کے نئے دَر وا ہوتے ہیں۔ انشائیے میں گردوپیش پھیلے ہوئے معاملات ایک نئے رنگ اور دل کشی پر مشتمل دکھائی دیتے ہیں۔

معمولی کو غیر معمولی کر دینا اور غیر معمولی کو معمولی بنا دینا، انشائیہ نگار کی نیرنگی نظر کا ادنیٰ کرشمہ ہے۔[6]

محمد سلیم ملک کے انشائیے ''ریڈیو'' میں سائنس کی ایک اور اہم ایجاد کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے۔ وہ بہاول پور کے ریڈیو اسٹیشن کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ اس کے مدمقابل چڑیا گھر ہے لہٰذا دونوں کا تقابل کیا جاسکتا ہے۔ اس انشائیے میں ریڈیو اسٹیشن میں جانے کے اصول و ضوابط بھی شامل ہیں جو خوش قسمت انسان معیار پر پورا اُترتے ہوئے ریڈیو تک رسائی حاصل کر لیتا ہے اس کی ملاقات پروڈیوسر سے ہوتی ہے جب کہ ریڈیو پروگرام کے باقاعدہ آغاز سے قبل میٹنگ رکھی جاتی ہے جس میں پروگراموں کے بارے میں تفصیل فراہم کی جاتی ہے۔ میٹنگ کے اختتام پر چائے سے تواضع بھی ایک اہم حصہ قرار پاتا ہے۔

آپ نظریں اٹھا کر ادھر ادھر دیکھیں تو سٹوڈیو کے اندر ایک دنیا آباد نظر آتی ہے۔ کچھ لوگ خطاب آہستہ آہستہ، جواب آہستہ آہستہ کی ولی دکنی کی ہدایت پر کام کر رہے ہیں۔ کچھ انشا پرداز قسم کے منشی فکرِ سخن میں خامہ بگوش بیٹھے ہیں۔[7]

محمد سلیم ملک کا انشائیہ ''اخبار دیکھنا'' میں اخبار بینی کے فوائد اور اس کی قدر و قیمت سے آگاہ کیا گیا ہے۔ بہت سے لوگ اخبار پڑھنے کے عادی ہوتے ہیں۔ ہر کسی کا انداز انفرادیت پر مبنی ہے۔ انشائیے میں مختلف لوگوں کی عادات سے واقفیت دلائی گئی ہے۔ بعض لوگ اخبار کو اُلٹ پلٹ کر

---

[5] محمد سلیم ملک، **باتیں ہماری یاد رہیں** (لاہور: بک ہوم، 2003ء)، 13۔

[6] فرمان فتح پوری، **اُردو نثر کا فنی ارتقاء** (لاہور: الوقار پبلی کیشنز، 1997ء)، 218۔

[7] محمد سلیم ملک، **باتیں ہماری یاد رہیں** (لاہور: بک ہوم، 2003ء)، 19۔

سرسری جائزہ لینے پر اکتفا کر لیتے ہیں۔ بعض لوگوں کا اوڑھنا بچھونا اخبار بن جاتا ہے۔ یہ لوگ اخبار کی راکھ سے اپنا ماضی تلاش کرتے ہیں جب کہ تنہائی میں اخبار ہی ان کا واحد سہارا بن جاتا ہے۔ اسی طرح گھریلو خواتین بھی اپنی من پسند چیزیں دیکھنے کے لیے اخبار کے ٹکڑوں کو اکٹھا کرتی ہیں جب کہ بچے اپنی دلچسپی کا سامان ڈھونڈتے دکھائی دیتے ہیں۔ محمد سلیم ملک بات سے بات نکالنے کے ہنر سے آشنا ہیں۔ وہ از راہِ مذاق کنواروں کے لیے "ضرورت رشتہ" کے کالم میں جھانکنے اور اپنی اُمیدوں کے چراغ روشن ہونے کا تذکرہ کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں بھی اخبار کی اہمیت کم نہیں ہوئی تاہم انٹرنیٹ نے عوام کو نت نئے راستوں سے واقف کرا دیا ہے لہٰذا لوگ اب اخبار کو اس شدت سے نہیں پڑھتے جیسے ماضی میں روایت تھی چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ بدلتے وقت کی ساعتوں میں عوام کے معیارات بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ محمد سلیم ملک کا اندازِ بیان دل کشی پر مبنی ہے۔ آسان فہم اور سادہ الفاظ سے انشائیہ اپنی بھرپور توجہ برقرار رکھتا ہے۔ انشائیے میں زندگی کے معاملات کو نئے زاویوں سے پیش کیا جاتا ہے جس میں قاری عام ڈگر سے ہٹ کر نئے پہلوؤں سے روشناس ہوتا ہے۔ انشائیہ نگار ذاتی تجربات کو حتمی صورت دینے کی بجائے بات سے بات نکالتے ہوئے انشائیہ تخلیق کرتا ہے۔ اس میں کسی قسم کی مشاورت یا حتمی نتائج اخذ نہیں کیے جا سکتے بلکہ شگفتہ انداز میں اختصار کے ساتھ ایک خوب صورت موڑ پر بات ختم کی جاتی ہے جس سے قاری کے ذہن و فکر پر تازگی کی کیفیت برقرار رہتی ہے۔ وہ اُداسی اور غمگینی کی بجائے خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔

انشائیہ اکڑی ہوئی گردنوں اور انانیت میں مبتلا لوگوں کو جھنجھوڑنے اور انھیں بیدار کرنے کا نام ہے۔[8]

محمد سلیم ملک کے انشائیے "الیکشن" میں ووٹ دینے کے طریقۂ کار اور عوام کے جوش و خروش کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ الیکشن کو ہنگامہ قرار دیتے ہوئے کارکنوں کی بھاگ دوڑ اور ووٹرز کی قدر و منزلت سے آگاہ کیا گیا ہے۔ اس انشائیے میں الیکشن کے دن کی صورتِ حال اور عوام کے جم غفیر کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ ایک طرف عوام کا ریلہ اس قدر ہوتا ہے کہ تِل دھرنے کی جگہ نہیں ملتی اور دوسری طرف لوگ ناچتے گاتے ہیں جب کہ انتخابی نتائج سے قبل خوف کا سماں ہوتا ہے۔ دن بھر کا میلہ شامِ غریباں کا منظر پیش کرتا ہے۔ نتائج کا اعلان ہو جانے کے بعد جیتنے والا کامیابی کا جشن مناتا ہے اور اپنے تمام دعوے پس پشت ڈالتے ہوئے عوام کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کی اگلی منزل پارلیمنٹ اور دیگر عہدے بن جاتے ہیں۔ وہ نئے راستوں پر چلتے ہوئے اپنی جیب بھاری کر لیتا ہے جب کہ ووٹر اپنی محرومیوں کے ساتھ آس لگائے اس انتظار میں بیٹھ جاتے ہیں کہ شاید اُن کی بھی سن لی جائے۔ بلاشبہ یہ ہمارا معاشرتی المیہ بن چکا ہے کہ انتخابات سے قبل لوگوں کو سبز باغ دکھائے جاتے ہیں اور پھر ان کی خبر گیری کوئی نہیں کرتا۔ محمد سلیم ملک نے ہلکے پھلکے انشائی انداز میں معاشرتی المیے پر گہرا طنز کیا ہے۔

"سپیڈ بریکر" میں راستے کی رکاوٹوں کو موضوع بنایا گیا ہے جو بظاہر رفتار میں کمی کا باعث بنتی ہیں تاہم ان کی وجہ سے گاڑیوں کو دھچکا لگتا ہے۔ بعض اوقات لوگ دھیان نہیں دیتے اور سپیڈ بریکر ٹائروں سے ٹکرا جاتا ہے جب کہ موٹر سائیکل سوار بھی اکثر و بیشتر اپنا توازن برقرار نہیں رکھ پاتے۔ ماضی میں خالص غذاؤں کی وجہ سے لوگ اپنا توازن برقرار رکھتے تھے۔ انھیں سپیڈ بریکر سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا تاہم آج کے دور میں غذا ناقص ہے اسی مناسبت سے سپیڈ بریکر بھی انتہائی دبلے پتلے بنائے جاتے ہیں۔ سپیڈ بریکر کی مختلف شکلوں کے بارے میں معلومات فراہم کی گئی ہیں۔ محض راستوں کی رکاوٹ کے لیے ان کا استعمال ضروری نہیں بلکہ امتحانات میں بھی بریکر لگائے جاتے ہیں تاکہ طالب علم کامیابی سے ہم کنار ہو کر ملازمت کی خواہش

---

[8] شفیق احمد، روشن آرا راؤ (مرتبین)، **انتخاب (انشائیہ نمبر)** (بہاول پور: شعبۂ اُردو و اقبالیات، اسلامیہ یونیورسٹی، 1988ء)، 80۔

نہ کرے جب کہ بعض طالب علم ایسی رکاوٹوں کو اچھل کود کرتے ہوئے پیچھے چھوڑ دیتے ہیں۔ محمد سلیم ملک ان نوجوانوں کو بلند ہمت قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح شادی کے بریکر سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ اس حوالے سے وہ یوں رقم طراز ہیں۔

شادی وہ کتاب ہے جس کا پہلا باب شاعری میں ہوتا ہے اور باقی نثر میں اِدھر یہ نوجوان، شاعری کو گنگنانے لگتے ہیں کہ ان کے گانے بجانے میں کھنڈت پڑ جاتی ہے اور ہر سال چھوٹے چھوٹے بریکر پیدا ہونے لگتے ہیں۔[9]

اکثر لوگ امیر ہونے کے خواب دیکھتے ہیں اور جب ان کے پاس بے بہا دولت اکٹھی ہو جائے تو پھر وہ باقی عمر عبادت گزاری میں مصروف رہتے ہیں جب کہ حکومت ان کی جائیداد کے بریکر لگا کر اپنا فرض ادا کرتی ہے۔

محمد سلیم ملک کا انشائیہ ''ٹھیلے والا'' میں ایک چلتے پھرتے کاروبار سے آشنا کیا گیا ہے۔ یہ کام بظاہر معمولی نوعیت کا ہے تاہم دکان کی نسبت ٹھیلے والا زیادہ فائدہ حاصل کرتا ہے۔ دکان دار ایک مخصوص جگہ بیٹھ کر اپنے کاروبار کو آگے بڑھاتا ہے جب کہ محمد سلیم ملک ٹھیلے والے کو ایسا پرندہ قرار دیتے ہیں جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔ یہ گلیوں میں آوازیں دے کر اپنا گاہک تلاش کرتا ہے۔ ٹھیلے والا ہر طرح کا سامان اپنے پاس رکھتا ہے اور اس کے بیچنے کا انداز بھی منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ ٹھیلے والوں کی کئی اقسام ہیں۔ یہ لوگ مختلف طرح کی چیزوں سے عوام کا دل لبھاتے ہیں اور انھیں مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ خریداری کریں۔ ٹھیلے والوں کے بارے میں ایک لطیفہ بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ میں ایک شخص نے جلیبیوں کا ٹھیلہ لگایا۔ لوگ انتہائی شوق سے جلیبیاں خریدتے تھے تاہم ایک انگریز بھی روزانہ خریداری کرتا جس پر ٹھیلے والا اس سے پوچھتا ہے کہ جلیبیاں سب گھر والے کھاتے ہیں۔ انگریز بتاتا ہے کہ وہ دراصل یہ جائزہ لیتا ہے کہ ان ٹیوبوں میں رس کیسے بھرتے ہیں۔ محمد سلیم ملک اپنے بھائی کو یہ لطیفہ سناتے ہیں تو وہ دیر تک ہنسنے کے بعد پوچھتے ہیں کہ یہ شیرہ کیسے بھرا جاتا ہے؟ اس انشائیے میں ٹھیلوں کو الگ دنیا قرار دیا گیا ہے۔ لوگ بھانت بھانت کی بولیوں سے گاہک کو متوجہ کرتے ہیں۔ ان ٹھیلوں کو دکانوں کے بچے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ موضوع انتہائی منفرد حیثیت کا حامل ہے۔

محمد سلیم ملک انشائیہ ''داخل کرانا بچوں کا، سکول میں'' کے عنوان سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے ابتدائی مراحل سے آگاہ کرتے ہیں۔ اس حوالے سے سرکاری اسکولوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جہاں بچوں کو مناسب ماحول فراہم نہیں کیا جاتا جب کہ غریب لوگ بچوں کی تعداد میں اضافہ کرتے ہوئے یہ اُمید قائم کر لیتے ہیں کہ ان کا کوئی بچہ بڑھاپے میں کام آ جائے گا۔ محمد سلیم ملک پرائیویٹ اسکولوں میں بھی معیارِ تعلیم سے مطمئن نہیں۔ لوگ انگریزی ناموں سے متاثر ہوتے ہیں چنانچہ یہ ادارے اُلٹے سیدھے نام رکھ کر اپنے کام کا آغاز کرتے ہیں اور پھر بچہ اسکول میں داخل ہو جائے تو پیسے بٹورنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد سلیم ملک اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں میں یکساں قدرت کے ساتھ لکھتے ہیں اور ان کے انشائیے، فیچر اور تنقیدی مضامین ملک کے معیاری جرائد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔[10]

''سپرنٹنڈنٹ'' کے عنوان سے لکھے گئے انشائیے میں مختلف عہدوں پر تعینات اعلیٰ افسروں کی کارکردگی کے بارے میں رائے شامل ہے۔ ماہر انسان اپنی بھرپور شخصیت کے ذریعے الگ پہچان رکھتا ہے جب کہ اس کے مزاج میں تیکھا پن بھی پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہاسٹل کا ''سپرنٹنڈنٹ'' یہ

---

[9] محمد سلیم ملک، **باتیں ہماری یاد رہیں** (لاہور: بک ہوم، 2003ء)، 35۔

[10] نواز کاوش، **بہاول پور کا ادب (اشاعت اول)** (بہاول پور: چولستان علمی و ادبی فورم، 2010ء)، 184۔

سمجھتا ہے کہ ہاسٹل اس کی ذاتی ملکیت اور لڑکے اثاثہ ہیں چنانچہ وہ اپنی من مانی کرتا ہے۔ اس انشائیے میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ سے متعارف کرایا گیا ہے جس کی عادات و اطوار ہاسٹل کے سپرنٹنڈنٹ جیسی ہوتی ہیں۔ ایک اور قسم امتحانی مرکز میں پائی جاتی ہے۔ یہ سپرنٹنڈنٹ خوف و ہراس پیدا کرتا ہے۔ طالب علم نقل کی غرض سے اپنے ہمراہ کوئی مواد لے کر جائیں تو ان کی شامت آجاتی ہے۔ اس حوالے سے چند واقعات کی روشنی میں سپرنٹنڈنٹ کے غیض و غضب سے متعارف کرایا گیا ہے۔ ایسے موقعوں پر مختلف طرح کے دلچسپ واقعات کو دل کش انداز میں بیان کیا گیا ہے جب کہ آخر میں نقل کے تمام ذرائع سپرنٹنڈنٹ کی ملکیت قرار دے کر واضح کہا گیا ہے کہ وہ اپنے اختیارات کا استعمال کرتے ہوئے امتحانی مرکز سے ان چیزوں کو وقتاً فوقتاً وصول کرتا رہتا ہے۔ انشائیہ انکشاف عرفان اور خط کے اجزاء سے مرکب ہوتا ہے اور یہی خصوصیات محمد سلیم ملک کے انشائیوں میں لطف و آگہی کا باعث ہیں۔

اسی طرح ''چائے نوشی'' میں موجودہ دور میں چائے سے رغبت کا احوال درج ہے۔ ماضی میں لسی کو اہمیت حاصل تھی جب کہ اس کی جگہ چائے نے لے لی۔ محمد سلیم ملک ان دنوں کا ذکر کرتے ہیں جب انھیں کچھ عرصہ کراچی میں رہنا پڑا اور وہاں لوگوں کے معمولات میں کثرت سے چائے کی موجودگی دیکھ کر وہ حیرت زدہ ہو گئے۔ اس انشائیے میں چائے بنانے کے مختلف طریقوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ محمد سلیم ملک اپنے دوست کے بارے میں لکھتے ہیں کہ وہ اپنی نگرانی میں چائے بنوا کر کیتلی کا مالک بن جاتا ہے جب کہ ایک اور دوست چائے کا گھونٹ طویل وقفے کے بعد بھرتا ہے اسی طرح چائے لوگوں کے لیے وقت گزارنے کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اس کے آداب میں بسکٹ کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی ہے جب کہ بعض لوگ پیالی کو ہاتھ لگائے بغیر منہ جھکا کر چائے پی لینے کی عادت میں مبتلا ہوتے ہیں۔:

انشائیہ آج کا سب سے موثر ذریعہ اظہار ہے۔ محمد سلیم ملک نے اپنے انشائیوں میں اس موثر ذریعہ اظہار کو عمدگی سے بیان کیا ہے۔[11]

''سگریٹ نوشی'' میں ان افراد کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے جو موقع محل دیکھے بنا اس کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ماضی میں لوگ احتیاط برتتے تھے تاہم موجودہ دور میں زمان و مکان کی کوئی قید نہیں۔ ریلوے اسٹیشن، فٹ پاتھ، دفتر اور گھروں میں بھی یہ کام بھرپور انداز میں جاری رہتا ہے۔ سگریٹ نوشوں کو اس بات کی قطعاً پروا نہیں ہوتی کہ ان کی وجہ سے دوسرے کس اذیت میں گزر رہے ہیں۔ وہ عوامی رویے کے بارے میں آگاہ کرتے ہیں کہ لوگ وقت کا خیال رکھے بغیر چائے اور کھانے سے سیر ہو جاتے ہیں۔ دعوتوں میں دھینگا مشتی کو دیکھتے ہوئے سگریٹ کی اس لیے تائید کی جاسکتی ہے کہ لیلیٰ کی انگلی اور مجنوں کی پسلی جیسی جسامت رکھنے والی سگریٹ، صرف سگریٹ نوشی تک محدود رہتی ہے البتہ سگریٹ کی پیٹھ پیچھے برائی ایک معمول کی بات بن چکی ہے۔ والدین، دوست، عزیز و اقارب، ڈاکٹر، محکمہ صحت، ریڈیو اور ٹیلی ویژن ہمیشہ اس کی مخالفت کرتے دکھائی دیتے ہیں۔

سگریٹ وہ برگ خشک ہے، جس پر کبھی خزاں نہیں ہوتی۔ یہ وہ کٹی شاخ ہے جس پر آگ کے پھول کھلتے ہیں۔ یہ سفید پوشی کا بھرم رکھتی ہے، اس لیے اُجلے سفید کپڑے پہنتی ہے۔[12]

محمد سلیم ملک بظاہر سگریٹ نوشی کی تائید کرتے ہیں تاہم معانی و مفاہیم میں گہرا طنز چھپا ہوا ہے یقیناً سگریٹ نوشی انسان کو اندر سے کھوکھلا کر دیتی ہے۔ اس انشائیے میں منفرد انداز سے سگریٹ نوشی کا احوال بیان کیا گیا ہے۔ اسی طرح ''سرگوشی'' کے عنوان سے لکھے گئے انشائیے میں اس بات

---

[11] سلیم آغا قزلباش، **کاغذی پیرہن** (اشاعت اول) (لاہور: 72۔ بیڈن روڈ، 2005ء)، فلیپ۔

[12] محمد سلیم ملک، **باتیں ہماری یاد رہیں** (لاہور: بک ہوم، 2003ء)، 79۔

پر افسوس کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ منہ چڑھ کر نہیں بولتی بلکہ آہستگی سے اپناوار کر جاتی ہے۔ سرگوشی اپنا اصل کام اس وقت شروع کرتی ہے جب گفتگو اور مکالمے ناکام ہو جاتے ہیں اور سرگوشی کی وجہ سے باتوں کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہو جاتا ہے۔ ماضی کے سادہ لوح انسان جو بات سوچتے، اسی کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے تھے۔ انھیں اس طرح کے طریقوں سے واقفیت نہیں تھی تاہم موجودہ زمانے میں خاموشی اور بول چال کے مابین سرگوشی کو بھی شامل کر لیا جاتا ہے لہٰذا کسی بھی محفل میں گفتگو کے دوران سرگوشی موقف میں تبدیلی کا باعث بن جاتی ہے۔ جو لوگ واضح انداز اپناتے ہیں ان کے لفظوں میں اُتار چڑھاؤ آجاتا ہے اور پھر وہ اپنا موقف تبدیل کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ انشائیے میں مختلف مثالوں کے ذریعے گفتگو کے بدل جانے کی وضاحت کی گئی ہے۔ سرگوشی کو چمکتا ہوا سکہ، نفسیاتی تھپکی اور تنویمی عمل قرار دیا جاسکتا ہے۔ ایک خاص پیرائے میں کی گئی گفتگو سرگوشی کے باعث اپنا وقار کھو بیٹھتی ہے۔

انشائیہ اصلاً ایک ساختیہ ہے جو اپنے عناصر کی حاصل جمع سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔[13]

محمد سلیم ملک انشائیہ ''غیبت'' میں اسے ایسی چیز قرار دیتے ہیں جو انسان کی تھکن اُتار دیتی ہے۔ موجودہ دور میں لوگ حق بات کہنے والے کے خلاف ہو جاتے ہیں جب کہ غیبت کی بدولت انسان نہ صرف لطف لے سکتا ہے بلکہ اپنا غم و غصہ بھی بھرپور انداز میں اُجاگر کرتا ہے۔ غیبت کہیں بھی بیٹھ کر یا کھڑے ہو کے کی جاسکتی ہے۔ انشائیے میں مختلف جگہوں کی تفصیل درج ہے جہاں غیبت کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی۔ اس حوالے سے سرکاری دفاتر، تاجر حضرات کی مخصوص نشستیں، کھیت اور کھلیان وغیرہ بھی غیبت کے زمرے میں آسکتے ہیں اسی طرح وقت کی قید بھی نہیں۔ غیبت کرنیوالے آپس میں سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں۔ غیبت کرتے ہوئے ایک دوسرے کو کافی دیر تک دیکھتے ہیں اور پھر قہقہے لگانا شروع کر دیتے ہیں جب کہ اس عمل میں ہر پہلو پر بات کرنے کے باوجود بھی انھیں محسوس ہوتا ہے کہ ابھی بھی بات ادھوری تھی۔

انشائیہ میں نثر کا آہنگ اور شاعری کی دل نشینی موجود ہوتی ہے۔[14]

محمد سلیم ملک کے اسلوب میں یہ خصوصیات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ ''خوشامد'' کے عنوان سے لکھا گیا انشائیہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایسی چیز ہے جو دوسروں کو فوری طور پر اپنا بنانے کے ہنر سے آشنا ہے۔ لوگ کئی طرح کی روش اختیار کر لیتے ہیں اور اپنا کام نکلوا کے ہی دم لیتے ہیں۔ افسر، اُستاد، مکینک، کلرک اور سپرنٹنڈنٹ خوشامد کے ہاتھوں مجبور ہو جاتے ہیں۔ خوشامد کو نظم و ضبط کا ذریعہ قرار دیتے ہوئے یہ موقف اختیار کیا گیا ہے کہ کس طرح لوگ فرماں برداری کو اپنا لیتے ہیں۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خوشامد پرندوں کے پر نوچ لینے کا نام ہے جب کہ یہ ایسا منہ زور گھوڑا ہے جو خوشامد کے ذریعے ہی رام کیا جاسکتا ہے۔ خوشامد کے ذریعے غیر اپنے بن جاتے ہیں اور افسر مہربان ہونے لگتے ہیں۔ بلاشبہ یہ انسان کی قسمت بدلنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اس انشائیے میں محمد سلیم ملک نے خوشامد کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔ انشائیہ نگاری غیر جانب داری سے شخصی رویوں کو منفرد طرز سے اُجاگر کرتی ہے جس کی وجہ سے اُردو ادب کی دیگر نثری اصناف کے مقابلے میں یہ صنف جداگانہ حیثیت کی حامل ہے۔:

انشائیے کے اسلوب میں شگفتگی پیدا ہوتی ہے جو مزاح تو نہیں لیکن اعصاب میں گدگدی ضرور ہو جاتی ہے۔[15]

---

[13] سنبل نگار، **اُردو نثر کا تنقیدی مطالعہ** (لاہور: کتاب سرائے، 2003ء)، 264۔

[14] محمد افتخار شفیع، **اصنافِ نثر** (لاہور: بیت الحکمت، 2012ء)، 113۔

[15] سلیم اختر، **انشائیہ کی بنیاد** (لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، 1986ء)، 114۔

محمد سلیم ملک ریڈیو پاکستان کے ایک پروڈیوسر کا احوال بیان کرتے ہیں جو اس بات پر غم و غصّے کا اظہار کرتے تھے کہ وہ سارا دن کام کرنے کے باوجود ہر وقت طلب کر لیے جاتے ہیں جب کہ کئی پروڈیوسر ایسے ہیں جو کچھ بھی نہیں کرتے اور بے فکر رہتے ہیں جس پر انھیں بتایا گیا کہ باز پرس کام کی وجہ سے ہوتی ہے۔ کام نہ کرنے والے کو کون پوچھ سکتا ہے۔ ایک پروفیسر کے متعلق بتایا گیا ہے کہ انھوں نے محض اس وجہ سے لکھنا چھوڑ دیا تھا کہ لوگ تنقید سے باز نہیں آتے تھے چناں چہ اب نہ لکھنے سے کسی قسم کی پریشانی میں مبتلا نہیں ہیں۔ لاپروائی ایسی چیز ہے جو کسی بھی قسم کی پریشانی میں مبتلا نہیں کرتی۔ انشائیہ سنجیدہ مضمون کو بھی مزاح کے پیرائے میں لے آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس میں مضمون نگاری جیسی خصوصیات کو تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ موضوع اور اسلوب کے لحاظ سے انشائیہ خاص وضع قطع کا حامل ہے۔

انشائیہ نگار کا اسلوبِ بیان تو منطقی ہوتا ہے لیکن وہ اپنی گفتگو کرنے کے انداز کو غیر رسمی بناتا ہے۔[16]

اس لطافت کو بعض ناقدین "ذہنی ترنگ" قرار دیتے ہیں جب کہ کئی موقعوں پر اسے "ادب کی پھلجھڑی" بھی کہا گیا ہے۔ انشائیہ "وعدہ" عہد و پیماں سے متعلق یاد رکھنے کی چیز ہے۔ موجودہ حالات میں لوگ وعدوں کا انبار لگا دیتے ہیں لیکن عملی طور پر کوئی وعدہ وفا نہیں ہوتا۔ وعدہ ایسے دھاگے کی مانند قرار دیا جا سکتا ہے جس میں باتوں کا سرا ختم ہونے کا نام نہیں لیتا۔ اگر اسے "بیج" قرار دیا جائے تو لوگ اس میں گفتگو کے پھول اُگا دیتے ہیں جب کہ حقیقت میں دیکھا جائے تو وعدہ ایسی بیساکھی ثابت ہوتا ہے جو دوسروں کو سہارے کا محتاج بنا دیتی ہے۔ وعدہ ذو معنی باتوں پر مشتمل قرار دیا جا سکتا ہے جب کہ یہ باتیں وقت کے ساتھ جھڑ جاتی ہیں۔ اس انشائیے میں بتایا گیا ہے کہ اُردو شاعری نے وعدوں کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا۔ وعدوں میں کثرت ان کا اعتبار ختم کر دیتی ہے جب کہ زمانے کی ترقی سے لوگ وعدے کے مفہوم سے نا آشنا ہو گئے ہیں۔

وعدوں کی بارش میں ہم بھیگتے تو ہر روز ہیں، مگر کیا مجال کہ شرمندہ تکمیل ہونے کا دامن ذرا بھی گیلا ہو جائے۔[17]

محمد سلیم ملک "تالیاں" کے عنوان سے انشائیے میں لکھتے ہیں کہ تقریر کے دوران ان کی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حاضرین میں ہر طرح کے لوگ شامل ہوتے ہیں جن میں سست، غافل، کاہل، چالاک، عیار اور اپنی جیسی دیگر خصوصیات بھی پائی جا سکتی ہیں تاہم تالیاں اپنا بھرپور اثر رکھتی ہیں۔ کئی موقعوں پر تالیاں مقرر کو جوش دلانے کے لیے بجائی جاتی ہیں جب کہ گھبراہٹ، کپکپاہٹ یا لہجے میں لکنت بھی تالیوں کا سبب کہلائی جا سکتی ہے۔ محمد سلیم ملک مقررین کے لب و لہجے اور گفتگو کے اُتار چڑھاؤ کو مدِ نظر رکھتے ہوئے تالیوں کی کئی اقسام سے متعارف کراتے ہیں۔

بعض تالیاں ابھرتی بڑے جوش و خروش سے ہیں مگر ان کا تعلق تقریر سے نہیں ہوتا۔ یہ کسی غرض و غایت سے بے نیاز رہتی ہیں اور اپنی ایک خاص ادا شان محبوبی رکھتی ہیں۔ یہ ہوتی تو مقرر سے بے تعلق ہیں مگر اپنی خوش گمانی میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میرا دل بڑھا رہی ہیں۔[18]

نئی، پرانی، چھوٹی، بڑی، سریلی، بے سُری، سڈول، بے سڈول، بے باک، بے حجاب، لچک دار اور خوشبو دار تالیاں اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہیں۔ انشائیہ نگاری دراصل مضمون کی ہی شکل قرار دی جا سکتی ہے تاہم اس کا انداز غیر رسمی گفتگو اور بے تکلفی پر مبنی ہوتا ہے۔ اس میں انشائیہ نگار داخلی جذبات و احساسات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے انوکھا انداز اختیار کرتا ہے جو سنجیدگی کی بجائے قاری کو زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

---

[16] محمد افتخار شفیع، **اصنافِ نثر** (لاہور: بیت الحکمت، 2012ء)، 111۔

[17] محمد سلیم ملک، **باتیں ہماری یاد رہیں** (لاہور: بک ہوم، 2003ء)، 96۔

[18] **ایضاً**، 101۔

انشائیہ نگار کو خاص طور پر سنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اسے اپنا مدعائے دل ظاہر کرنے کے لیے بے تکلف ہونا چاہیے۔[19]

"عید کارڈ" کے عنوان سے لکھے گئے انشائیے میں عید کارڈ کو ایک رسم قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ اس کے آغاز کی تفصیل نہیں ملتی تاہم لوگ نہایت خلوص سے ایک دوسرے کو کارڈ بھیج کر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ محمد سلیم ملک سمجھتے ہیں کہ عید کارڈ کے لیے باقاعدہ ایک ملازم چاہیے جو اُن کی تفصیلات کا اندراج کرے اور انھیں ترتیب سے رکھے۔ عید کارڈ میں درجہ بندی کے بارے میں آگاہ کیا گیا ہے جس طرح انسان مختلف طبقات میں منقسم ہیں۔ عید کارڈ بھی اپنی ظاہری شکل وصورت لکھائی اور عبارت میں مختلف درجوں پر فائز ہیں۔

عید کیا آتی ہے صبح، دوپہر، شام عید کارڈ چلے آتے ہیں۔ یہ نئے زمانے کے وہ کبوتر ہیں، جو ڈاک کی ہوا میں اڑتے پھرتے ہیں۔[20]

محمد سلیم ملک اپنے طالب علموں کی جانب سے موصول کیے گئے انگریزی زبان میں عید کارڈز کے حوالے سے اپنے تاثرات قلم بند کرتے ہیں۔ انشائیے میں مختلف انداز کے حامل عید کارڈز دیکھ کر ان کے بارے میں اظہارِ خیال شامل کیا گیا ہے۔ ان میں بے زبان صاحبِ قلم، مسکین، دفتری، سرکاری اور نجی قسم کے عید کارڈ اپنی الگ پہچان رکھتے ہیں۔ موجودہ دور میں دیکھا جائے تو عید کارڈ کی روایت دم توڑ چکی ہے کیوں کہ آج کے دور میں سوشل میڈیا نے انسان کو نئے زاویوں سے دیکھنے کا عادی بنا دیا ہے۔

انشائیہ ایک صنفِ ادب کے طور پر کسی مقصد کا آلہ کار نہیں بنایا جاسکا۔[21]

موجودہ دور انٹرنیٹ کا ہے تاہم یہ انشائیے بیسویں صدی کے آخر میں ان موضوعات کا بھرپور اظہار لیے ہوئے ہیں کہ جب انسانی زندگی میں تبدیلی کا سلسلہ تیز رفتاری سے جاری تھا، اخبارات پڑھنا معمول کی بات تھی جب کہ موبائل فون کا آغاز نہیں ہوا تھا اسی طرح ٹیلی فون اور اس سے وابستہ یادیں اس دور کی عکاس ہیں کہ جب دلوں میں ایک دوسرے سے کدورت کی بجائے محبت اور خلوص کا رشتہ قائم تھا، عید کارڈ آج کے دور میں ناپید ہو چکے ہیں جب کہ چند دہائیاں قبل اس رسم کو عید کی خوشیوں میں لازمی جزو قرار دیا جاتا تھا۔ محمد سلیم ملک عہد رفتہ کو آواز دیتے ہیں تو ایک خاص قسم کا ماحول یہ احساس دلاتا ہے کہ اکیسویں صدی نے پچھلی صدی کی کئی خوبصورت چیزیں نگل لی ہیں۔ اسی طرح بہت سے معاملات میں انسانی عادات واطوار جوں کی توں ہے۔ ان حقائق سے پردہ اٹھاتے ہوئے جہاں قاری خوشگوار احساس میں مبتلا ہوتا ہے وہیں محمد سلیم ملک کی انسانی نفسیات کے حوالے سے شعور و آگہی انشائیوں میں رونق بڑھا دیتی ہے۔ بلاشبہ قدیم وجدید طرز کی حامل کتاب "باتیں ہماری یاد رہیں" نا صرف موضوعات کے لحاظ سے منفرد ہے بلکہ یہ انشائیے سادہ اور دلچسپ مثالوں کی بدولت قاری کو بھی سرشاری میں مبتلا کرتے ہیں۔

☆☆☆

---

[19] شاہد حسن رضوی، **الزبیر۔ اصنافِ ادب نمبر** (بہاول پور: اردو اکیڈمی، س۔ن ء)، 139۔

[20] محمد سلیم ملک، **باتیں ہماری یاد رہیں** (لاہور: بک ہوم، 2003ء)، 104۔

[21] اکبر حمیدی، **جدید اُردو انشائیہ** (اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان، 1991ء)، 30۔